R. No 2186/41.

Regd. No. A. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

ایک پرچہ

دس نئے پیسے

Telephone No. 31

Telegrams "ANJUMAN"

جلد ۲۰ - شمارہ ۱۹ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | علی گڑھ - ۱۵رمئی ۱۹۶۱ء

رفیق عزیز بیگ

اُردو ٹائپ

ٹائپ کے متعلق [illegible]ی زبان مورخہ ۲۲ر مارچ ۱۹۶۱ء میں جناب عبدالرزاق قریشی کا مراسلہ نظر سے گذرا۔ یہ عجیب بات ہے کہ جو اقتصادی اور تجارتی وجوہ دوسری زبانوں میں ٹائپ کی ایجاد اور رواج کا سبب بنیں وہی اُردو میں ٹائپ کے استعمال میں رکاوٹ ہیں۔ انتہا ہے کہ ایسے اشخاص اور ادارے بھی جو ٹائپ کو مقبول دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے اپیلیں کرتے رہتے ہیں مجبور ہیں کہ اسے استعمال نہ کریں۔ ٹائپ سے اس گریز کے اسباب کیا ہیں اور اس صورتِ حال پر کس طرح قابو پایا جاسکتا ہے؟ مراسلہ نگار موصوف نے اس بارے میں بروقت متوجہ کیا ہے۔ بلاشبہ یہ بڑا اہم مسئلہ ہے۔ اُردو کی ترقی کے لئے اور اُردو طباعت کو نئے معیار پر لانے کے لئے اسے حل کرنا بہت ضروری ہے۔

تصاویر اور نقشے، عبارت کے ساتھ ایک ہی داب میں چھاپنے اور بہت بڑی تعداد میں چھاپنے کے لئے ٹائپ کا طریقہ ایجاد کیا گیا تھا۔ اس میں کفایت اور روپے کی بچت بھی تھی لہٰذا غیر زبانوں میں یہ طریقہ بہت کامیاب رہا۔ ہمارے یہاں ٹائپ کا طریقہ اس لئے کامیاب نہیں ہوا کہ ہمارا رسم خط نستعلیق ہے اور نستعلیق ٹائپ کی تیاری اور استعمال ہوشربا مصارف کے باعث عملاً محال ہے۔ اب رہے اُردو کے نسخ ٹائپ، وہ تحریری رسم خط سے اختلاف اور بمقابلہ کتابت کمپوزنگ کے بہت زیادہ گراں ہونے کے باعث کبھی قبول عام حاصل نہیں کرسکے۔

جب تک آفسٹ کی چھپائی عام نہیں ہوئی تھی اعلیٰ قسم کی کتابیں اور کثیر الاشاعت مطبوعات ٹائپ میں چھپ جاتی تھیں لیکن اب یہ صورتِ حال نہیں اور ٹائپ سے اُردو پبلشروں کی دلچسپی ختم ہوگئی ہے۔ اگر اُردو تحریر اور ٹائپ کے رسوم خط میں اتنا اختلاف نہ ہوتا تو یقیناً ہمارے پبلشر بھی لیتھو کی ارزانی کو زیادہ اہمیت نہ دیتے اور ٹائپ کو اس کی برتری کے باعث فوراً اختیار کرلیتے۔ برصغیر کی بعض دوسری زبانوں مثلاً ہندی اور سندھی کے پبلشروں کی مثال سامنے ہے۔ دیوناگری کے کاتب اب بھی موجود ہیں لیکن ہندی کے پبلشر کتابت کی اسکی ارزانی کے باوجود کبھی ٹائپ پر ترجیح نہیں دیتے۔ یہی حال سندھی کا ہے۔ سندھی کا رسم خط نسخ ہے۔ اسی رسم خط میں اس زبان کا ٹائپ تیار ہوا ہے جس کو پبلشر بخوشی استعمال کرتے ہیں اور کتابت پر ترجیح دیتے ہیں۔

اُردو ٹائپ کے رواج میں سب سے بڑی مشکل رسم خط کی ہے۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ موجودہ حالات میں اُردو کا رسم خط نستعلیق سے بدل کر نسخ کردینا بھی ممکن نہیں۔ کم سے کم یہاں ہندوستان میں، رسم خط کی یہ تبدیلی اُردو کی ترقی میں ایسی رکاوٹیں پیدا کرے گی جن پر قابو نہیں پایا جاسکے گا۔

پھر کیا کیا جائے؟

اُردو ٹائپ کو رائج کرنے میں دو رکاوٹیں ہیں۔

(۱) ٹائپ اور تحریر کے رسوم خط کا اختلاف۔

(۲) بمقابلہ کتابت کمپوزنگ کی گرانی۔

مجھے یقین ہے اگر ہم ان دو رکاوٹوں میں سے کسی ایک کو پوری طرح دور کردیں اور دوسری کی شدت کو کم کردیں تو اب بھی اُردو ٹائپ رائج کیا جاسکتا ہے۔ ٹائپ اور تحریر کے رسوم خط کا اختلاف دور کرنا تو ممکن نہیں۔ اس لئے کوشش یہ ہونی چاہئے کہ اس اختلاف سے پیدا ہونے والی دشواری کو کم کردیا جائے۔

دوسری طرف ٹائپ میں ایسی اصلاحات اور ایجادات کی جائیں کہ کمپوزنگ ویسی ہی سستی اور آسان ہو جائے جیسی کتابت ہے۔ یہ دونوں مقاصد ٹائپ کے جوڑوں کی تعداد میں ہر ممکن کمی کرنے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

خوش قسمتی سے ٹائپ میں اصلاح کرنے والوں کا طریق کار بھی یہی رہا ہے۔ چنانچہ حیدرآبادی نسخ ٹائپ کے بعد جو ٹائپ تیار ہوئے ان میں جوڑوں کی تعداد مذکورہ ٹائپ کے مقابلہ میں خاصی کم ہے۔ لیکن ایک خرابی یہ ہوئی کہ اصلاح کی ان کوششوں میں رسم خط سے مطابقت پر بھی پورا پورا زور دیا گیا۔ جس کا افسوسناک نتیجہ یہ نکلا کہ یہ اصلاح شدہ نسخ ٹائپ بھی ہمارے لئے زیادہ کارآمد نہیں رہے۔ ان کے جوڑوں کی تعداد اب بھی بہت زیادہ ہے۔ ان سے کام لینا اب بھی انتہائی دشوار اور نہایت گراں ہے۔ نیز وہ سہولت بھی حاصل نہیں جو ٹائپ اور تحریر کے رسوم خط کی یکسانی کا نتیجہ ہوتی ہے (کیونکہ ہمارا تحریری رسم خط نستعلیق ہے) ان کی ٹیکنیکل دشواریوں اور پیچیدگیوں کے باعث کمپوزیٹر کے کام کی رفتار اور مقدار بہت کم ہے۔ مزید برآں پریس ٹائپ کے جوڑوں کی یہ مروجہ اشکال ٹائپ رائٹر اور لائنو ٹائپ میں کام نہیں دے سکیں چنانچہ ان مشینوں کے لئے جہاں جہاں بھی ان کا استعمال شروع ہوا حروف کی نئی نئی شکلیں بنانی پڑیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اردو جاننے کے لئے دو مختلف رسوم خط میں اور ان کے حروف کی سینکڑوں اصلاح شدہ شکلوں میں مہارت ضروری ہو گئی۔ جو یہ ہیں:-

۱۔ [illegible] کے لئے نستعلیق رسم خط یعنی فارسی حروف۔

۲۔ پریس ٹائپ کے لئے نسخ رسم خط یعنی عربی حروف۔

۳۔ ٹائپ رائٹر میں استعمال کے لئے ترمیم شدہ نسخ رسم خط ٹائپ رائٹر کی مشینی اور ٹیکنیکل ضروریات کے باعث نسخ حروف کی شکلوں میں ایسی تبدیلیاں کرنی پڑیں کہ مروجہ نسخ حروف سے الگ اور جدا نظر آنے لگے۔

۴۔ غضب یہ ہوا کہ لائنو ٹائپ کے لئے ان نو ترمیم شدہ نسخ حروف نے بھی کام نہیں دیا۔ حروف کی شکلوں کو پھر بدلنا پڑا اور اس طرح بدلنا پڑا کہ ان پر نئے رسم خط کا گمان ہونے لگا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ "سرسری اندازہ کے مطابق" اردو تحریر اور طباعت میں استعمال ہونے والے حروف اور ان کی مختلف شکلوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار تک پہنچ گئی۔ اردو جاننے والے ہر شخص کے لئے ان کا جاننا اور ان کے محل استعمال سے واقف ہونا ضروری ہو گیا۔ ممکن ہے کوئی صاحب اسے بھی اردو کی وسعت اور ہمہ گیری کا ثبوت قرار دیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اردو کی ترقی میں یہ امر جس طرح رکاوٹ ہے اس کا عام اعتراف نہیں، لیکن اس سے انکار بھی ممکن نہیں۔

اگر نسخ ٹائپ کو قابل قبول بنانا مقصود ہے تو سب سے پہلے ٹائپ کی رسم خط سے مطابقت کا اصول ترک کر دینا چاہئے۔ اردو کے بعض پریس ٹائپوں اور لائنو ٹائپ میں رسم خط سے مشابہت کا اصول پیش نظر رکھا گیا جس کا اچھا نتیجہ نکلا۔ ٹکڑوں کی تعداد میں خاصی کمی ہوئی۔ بیشتر حروف کے دو دو ٹکڑوں سے وہ سارا کام لیا گیا جو پہلے چار چار اور چھ چھ ٹکڑوں سے لیا جاتا تھا۔ لیکن منزل پھر بھی دور ہی رہی اور ان میں سے کوئی ٹائپ بھی کتابت کے برابر ارزاں نہیں ہو سکا اور نہ اسے عام مقبولیت حاصل ہو سکی۔

میری رائے میں اس کا واحد سبب یہ ہے کہ ان ٹائپوں میں مکمل اصلاح و ترمیم نہیں کی گئی بلکہ اس کام کو ادھورا چھوڑ دیا گیا۔

ہماری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ رسم خط سے مشابہت کو ملحوظ رکھتے ہوئے حروف کی شکلوں میں ایسی تبدیلی کریں کہ ایک ٹکڑا سب جگہ کام دے سکے۔ ایک مثال دے کر اپنی بات واضح کروں۔ لائنو ٹائپ میں ب کی دو شکلیں مستعمل ہیں۔ ایک بے کا شوشہ (بـ) اور دوسرے پوری ب۔ کیا ہم ایسا نہیں کر سکتے کہ مجوزہ آسان اردو ٹائپ میں صرف بے کا شوشہ شامل کریں اور جہاں کہیں پوری بے کمپوز کرنی ہو شوشہ کے بعد کشتی بڑھا دیں۔ پ ت ٹ ث ف ک گ وغیرہ کی بھی یہی صورت ہوگی۔ اس طرح "سولہ ٹکڑوں کا کام صرف نو ٹکڑوں سے لیا جا سکے گا"۔ تحریر میں متصل لکھے جانے والے دوسرے حروف کو بھی اسی پر قیاس کر لیجئے۔ جو حروف تحریر میں منفصل رہتے ہیں مثلاً د ڈ ذ ر ڑ ز ژ و وغیرہ ان کا ایک ایک ٹکڑا ہی کام دے سکے گا۔ اس سلسلے میں تجربات کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کم و بیش پچاس ٹکڑوں میں اردو کا پورا ٹائپ تیار کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ ہم پرانی لکیروں کو نہ پیٹتے رہیں اور اپنی ایک اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لئے حروف کی شکل میں خفیف رد و بدل کے لئے تیار ہو جائیں۔

مجھے یقین ہے کہ اس طرح جو ٹائپ تیار ہوگا اگرچہ وہ نسخ کے عین مطابق نہ ہوگا لیکن اس سے زیادہ مختلف بھی نہ ہوگا۔ اس میں نسخ سے اتنی مشابہت ضرور ہوگی کہ نسخ جاننے والے اسے آسانی سے پڑھ لیں گے نستعلیق جاننے والوں کو اس میں یہ سہولت ہوگی کہ انھیں صرف پچاس نئے جوڑ سیکھنے ہوں گے۔ یہ کام نسخ ٹائپ کے سینکڑوں جوڑوں کو سیکھنے اور یاد رکھنے کے مقابلہ میں یقیناً آسان ہے۔ یہی جوڑ ٹائپ مشینوں میں بھی استعمال ہو سکیں گے جوڑوں کی تعداد انتہائی کم ہو جانے بلکہ مروجہ ٹائپوں کے مقابلے میں $\frac{1}{5}$ رہ جانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اردو ٹائپ کی تیاری، خریداری وغیرہ کے لئے پہلے کے مقابلے میں سرمایہ کا صرف پانچواں حصہ درکار ہوا کرے گا۔ کمپوزنگ بہت آسان اور سستی ہو جائے گی۔ کمپوزیٹر کے کام کی رفتار اور مقدار پہلے کے مقابلے میں پانچ گنی بڑھ جائے گی۔ (باقی صفحہ ۱۲ پر)

پیغام نسیم

[illegible]

ہماری زبان

۱۵ر مئی ۱۹۶۱ء

ٹیگور کی یاد میں

۸ر مئی سے سارے ملک میں ٹیگور کو خراج عقیدت پیش کیا جا رہا ہے۔ دوسرے ملکوں میں بھی ادیبوں اور دانش وروں کے جلسے ہو رہے ہیں اور ٹیگور کے گن گائے جا رہے ہیں۔ ٹیگور یوں تو بنگال کے فرزند تھے، مگر دراصل پورے ہندوستان کو اُن پر فخر ہے۔ اُنھوں نے نہ صرف بنگالی ادب کو عظمت اور شان عطا کی، بلکہ ہندوستان کا نام اونچا کیا۔ وہ اتنی ہمہ جہت اور ہمہ گیر شخصیت رکھتے تھے کہ اُن کے کارناموں کا جائزہ چند مضامین تو کیا چند کتابوں میں بھی پوری طرح نہیں لیا جا سکتا۔ ہاں ان کی عظمت کے چند پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے اور یہی ان سطروں کا مقصد ہے۔

ٹیگور شاعر تھے اور بڑے شاعر۔ اُن کی نظموں میں خوابوں کے وہ رنگ محل ہیں جن سے انسانیت کا حسن باقی ہے۔ ان میں وہ ترنم ہے جس سے روح کے تار بج اُٹھتے ہیں۔ فطرت کا وہ عرفان ہے جو سچی اور گہری پرستش سے آتا ہے۔ زندگی کے تسلسل کا وہ احساس ہے جو ماضی، حال، مستقبل میں ایک معنی خیز رشتہ پیدا کرتا ہے۔ ان کے الفاظ میں بنگال کے دریاؤں کا تموج، وہاں کی ہریالی، وہاں کے پھولوں اور پودوں کی خوشبو، وہاں کے جنگلوں کی موسیقی اور وہاں کے باسیوں کی خواب آلود بیداری سب سما گئی ہے۔

اُنھوں نے بہت سے گیت بھی لکھے اور طویل نظمیں بھی۔ پھر اُن کی مضطرب روح نے صرف شاعری کی فضا میں پرواز کو کافی نہیں سمجھا۔ نثر کے ذریعہ سے دھرتی پر چلنے اور زندگی کے دُکھ درد کو سمجھنے اور سمجھانے کی بھی کوشش کی۔ اُنھوں نے اپنی کہانیوں، ناولوں اور ڈراموں میں بنگال اور ہندوستان کی ساری ستم دیدہ مگر لائق ستائش مخلوق سمو دی۔ آرزوؤں اور اُمیدوں کے کتنے سہانے گیت، حسرتوں اور ناکامیوں کے کتنے زخم، روحانیت اور انسانیت پر اعتقاد کے کتنے بھاشے، علم و حکمت کے کتنے نسخے، ان تصانیف میں آگئے ہیں اور کیسی خوبی سے آئے ہیں۔

پھر ٹیگور نے شعر و ادب کو من کی موج نہیں سمجھا۔ اسکی خاطر کسی نوری گنبد میں مقید ہو کر نہیں بیٹھے، بلکہ فنون لطیفہ کی ترویج کے ذریعہ سے پیاسی اور ترستی ہوئی روحوں کو سیرابی اور سرشاری عطا کرنے کی کیسی برگزیدہ مہم چلائی۔ تعلیم کو بے روح ہوتے ہوئے دیکھا تو شانتی نکیتن میں شاداب روحوں کی بستی قائم کی۔ مشرقیت کو محدود پایا تو مغرب سے علم کی نئی کرنیں لیں۔ مغرب کو میکانکی اور جابر دیکھا تو اسے مشرق کی روحانیت کا درس دیا۔ سیاست دانوں کو اعلیٰ مقاصد سے آشنا کیا۔ وطنیت سے بین الاقوامیت اور مذہب کو فصل کے لئے نہیں وصل کے لئے برتا۔ تعلیم میں تجربے کئے، ہر نئی کرن کو آنکھوں میں جگہ دی۔ مگر اپنے آفتاب و ماہتاب کو سینے سے لگائے رہے۔ شاعری کو اس عاشق نے واقعی جزویست از پیغمبری، بنا دیا۔

ٹیگور سے آج مہذب دنیا اچھی طرح واقف ہے۔ ان کی تصانیف کے تراجم تمام بڑی بڑی زبانوں میں ہو چکے ہیں یا ہو رہے ہیں۔ ان کی عظمت کو ساری دنیا مانتی ہے۔ مگر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ خود ہندوستان میں ان سے عقیدت ضرور ہے مگر ان کی تصانیف کا علم کم ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم ٹیگور کی نظموں کا ہی مطالعہ نہ کریں، بلکہ ان کے افسانوں، ناولوں اور ڈراموں کو بھی دیکھیں اور اُن کے مضامین سے بھی استفادہ کریں۔

ٹیگور کا اثر یوں تو ہر ہندوستانی زبان پر ہوا ہے، اور اُردو زبان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے، مگر یہ اثر صرف گیتان جلی کے شاعر ٹیگور کا ہے اور ٹیگور صرف گیتان جلی کا شاعر نہیں، وہ شاعر اعظم ہے۔ اُردو میں پریم چند ضرور ایسے افسانہ نگار ہیں جن کے یہاں ٹیگور کا اثر نمایاں ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹیگور کے بیشتر افسانے یا ڈرامے ہندی کے معمولی ترجموں کے ذریعہ سے اُردو دانوں تک پہنچے ہیں اور ان کی نظموں کے ترجمے بیشتر انگریزی سے کئے گئے ہیں۔ اُردو تراجم میں صرف ضیاءالدین نے براہ راست بنگالی سے نظموں کے ترجمے کئے ہیں اور یونس احمر نے افسانوں کو براہ راست بنگالی سے منتقل کیا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ ساہتیہ اکاڈمی امسال ٹیگور کی تصانیف کے ترجمے تمام ہندوستانی زبانوں میں شائع کر رہی ہے جن میں سے بیشتر بنگالی سے کئے گئے ہیں۔ یقین ہے کہ ان کے مطالعے سے اردو داں طبقہ بھی ٹیگور کی حقیقی عظمت کو پا سکے گا۔

ٹیگور ہمارے لئے روشنی کے ایک مینار ہیں۔ اُن کی وطنیت ہمیں وطنیت کے محدود اور جارحانہ تصور سے بلند کرتی ہے۔ اُن کی انسان دوستی ہمیں آفاقیت سے ہم کنار کرتی ہے۔ اُن کے یہاں مقامی فضا اور مقامی رنگ ہمیں اپنی دھرتی سے اپنا رشتہ استوار رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ اُن کے تعلیمی تجربے، آج بھی ہمارے تعلیمی اداروں کی گھٹن اور بے جان فضا میں نیا رنگ و

آہنگ دے سکتے ہیں۔ ان کی جامعیت ہمیں سکھاتی ہے کہ شاعری کو نثر اور علوم اور تنقید سب سے مدد ملتی ہے اور فنون لطیفہ سے آشنا ہونا اس میں اور بھی بلندی پیدا کرتا ہے۔ مگر بڑی بات یہ ہے کہ اُن کی زندگی اشاعروں اور ادیبوں کے لئے ایک دعوت ہے، زندگی اور ماحول کی ہر کروٹ سے متاثر ہونے کی اور سیاسی گروہ بندیوں میں گرفتار نہ ہوتے ہوئے سیاسی شعور رکھنے اور سیاست کی روح کو سمجھنے اور سمجھانے کی اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ ان کے مطالعے سے ہمیں زندگی اور انسانیت سے کسی حال میں مایوس نہ ہونے کی صلاحیت ملتی ہے اور آج کے دور میں اس کی ضرورت سب سے زیادہ ہے کہ انسان مایوس نہ ہو، یعنی اپنا سب کچھ لٹانے یعنی "ٹھکانے لگانے" کے لئے تیار رہے۔

نجات

(از حضرت روش صدیقی)

(ٹیگور کی ایک بنگالی نظم "مکتی" کا

آزاد و مستزاد منظوم ترجمہ)

خیالِ ترکِ تمنا کہاں مرے دل میں
کہ یہ کچھ اور تو ہے گوشۂ نجات نہیں
مری نجات تو ہے حلقۂ سلاسل میں

●

ترے فروغِ تصور سے روشنی لے کر
جلا کے شوق و تمنا کے بے شمار چراغ
کروں گا نذر ترے آستانِ زرّیں پہ

●

اسیرِ ضبط رہیں کیوں مری تمنائیں
عیاں ہے مجھ پہ یہ رازِ مسرتِ ابدی
کہ میرے چشم و لب و گوش کیلئے اے دوست
ہے تیرا لمس دل افروز جنتِ ابدی

●

ہوس، ہوس ہے گماں ہے گماں مگر اک دن
ہوس کو عشق و وفا کا امیں بھی ہونا ہے
گماں کو غازۂ حسنِ یقیں بھی ہونا ہے

(باقی ہے)

ٹیگور کو امریکی شاعر کا خراجِ عقیدت

جشن ٹیگور کے سلسلے میں نیویارک کے ٹاؤن ہال میں ایک عظیم یادگاری تقریب منعقد ہوئی جس میں امریکہ کے ملک الشعراء رابرٹ فراسٹ اور مشہور و معروف رسالہ سیٹرڈے ریویو کے ایڈیٹر نارمن کزنز نے اپنی تقریروں میں ٹیگور کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

ٹیگور کی نظموں کا انتخاب روسی زبان میں

ماسکو ۹ مئی۔ ہندوستان کے عظیم شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کا ایک انتخاب روسی زبان میں ماسکو میں شائع ہوا اس انتخاب میں تقریباً ایک سو نظمیں ہیں۔

اس انتخاب کو عوام کے سامنے شاعر موصوف کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر پیش کیا جائے گا۔ ماسکو میں ان کی سال گرہ کا افتتاح ان کے ادب پاروں کی پہلی جلد کی اشاعت سے کیا جائے گا یہ کتاب ۱۲ جلدوں پر مشتمل ہوگی۔

ازبک میں آٹھ جلدوں کی اشاعت کا کام شروع کر دیا گیا ہے۔ شاعر موصوف کے مزید ادب پاروں کی اشاعت کا کام ہمہ گیر طور پر سوویت یونین کے دیگر شہروں میں بھی ہوگا۔

ٹیگور کی چھ تصانیف کا اُردو ترجمہ

ساہتیہ اکاڈیمی کی جانب سے اشاعت۔ نئی دہلی ۹ مئی۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر ساہتیہ اکاڈیمی نے رابندر ناتھ ٹیگور کی چھ تصانیف کے اُردو ترجمے شائع کئے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:-

ایکو تر استی (ٹیگور کی ۱۰۱ نظمیں) مترجم فراق گورکھپوری۔ ایک وِنستی (ٹیگور کے ۱۲۱ افسانے) مترجم ابوالحیات برووائی۔ ٹیگور کے تین ڈرامے (راجہ، ڈاک گھر اور رکت کرابی) مترجم پروفیسر محمد مجیب۔ گورا (ناول) مترجم سجاد ظہیر۔ چوکھ بلی (ناول) مترجم ڈاکٹر عابد حسین۔ جوگا جوگ (ناول) مترجم ایس۔ اے۔ آر۔ کاظمی رضا مظہری۔ (مرکزی اطلاعات)

ٹیگور کے بارے میں برطانیہ کے اسکول کے بچوں میں انعامی مقابلے

لندن ۳ مئی۔ لندن میں ٹیگور کی صد سالہ جشن کے سلسلے میں اسکول کے بچے ایک انعامی مقابلے کے لئے ٹیگور پر مضامین لکھیں گے اور جو چھ طالب علم اس مقابلے میں جیتیں گے انھیں حکومت ہند کی طرف سے ہندوستان آنے کی دعوت دی جائے گی۔

کاوش بدری

غزل

کتنی نظر فروز مری زندگی ہوئی!
ہیں مجھ پہ کائنات کی نظریں اٹھی ہوئی
کب صفحۂ سرور پہ پہونچے مری نگاہ
اب تک کتابِ غم ہے کھلی کی کھلی ہوئی
اس درجہ کھو گیا ہوں ترے انتظار میں
میری نظر کی سانس ہے گویا رکی ہوئی
اتنے دراز ہیں تری قربت کے فاصلے
خود میری ذات میرے لئے اجنبی ہوئی!
اللہ رے سرفرازیِ مینائے اہلِ دل
ہر موجِ خوں بھی موجِ مئے آگہی ہوئی
یوں لگ رہا ہے سر پہ ترا آنچل اڑا ہوا
جیسے افق پہ قوسِ قزح ہو تنی ہوئی
صد شکر آفتاب بدست آ گئے ہیں ہم
ہر گوشۂ حیات میں اک روشنی ہوئی
کس دل سے ہو وطن کا نظارہ بقدرِ شوق
اٹھتی ہے خود نگاہ بھی کاوش تھکی ہوئی

فنا پرتاب گڈھی

غزل

آپ نے بخش دیا ہے جنھیں سرمایۂ غم
دیکھنا وہ بھی نہ بن جائیں کہیں اہلِ کرم
بزم میں اس لئے ہم تیرا گلا کرتے ہیں
تا کہ مل جائیں تجھے اور بھی عنوانِ ستم
دوستوں میں کبھی اس بحث کو رکھنا ہے مجھے
"کس کے ہاتھوں سے پڑی دہر میں بنیادِ ستم"
اس حقیقت سے فنا آپ نہ انکار کریں
کام آتے ہیں برے وقت میں پتھر کے صنم

خاور بانکوٹی

غزل

تری جفاؤں کے امیدوار ہیں کتنے
ہماری طرح محبت شعار ہیں کتنے
بہت سے لوگ ہمیں دیکھنے تو آتے ہیں
ہمارے غم کے یہاں رازدار ہیں کتنے
ہمارا کام سفر ہے ہمیں خبر کیا ہے
کہ راہِ شوق میں گل کتنے خار ہیں کتنے
یہ موجِ گل یہ بہاریں یہ سبزہ زارِ چمن
ہیں دلنشیں تو، مگر پائدار ہیں کتنے

افتخار احمد فہمی

قطعہ

بدلی ہوئی دنیا میں بدل جاؤ تو بہتر
خود بینی کو اب قصۂ پارینہ سمجھ لو
خلقت کے تصور میں یہ تصویر ہماری
دنیا کی نگاہوں کو بھی آئینہ سمجھ لو

صبا اکبرآبادی

غزل

اس وفا دشمن کا دلدادہ رہا
عشق رنگیں کس قدر سادہ رہا
یوں تو اس محفل سے سب چھک کر اٹھے
صرف میرا جام بے بادہ رہا
اس نے دل کو بھی نہ پوچھا اور میں
جان دینے پہ آمادہ رہا
سادگی حسن بھی تھی دل فریب
عشق پرکاری میں بھی سادہ رہا
اس نظر کی پیروی دل نے جو کی
بے نیازِ منزل و جادہ رہا
اس نے مشقِ ناز فرمائی صبا
پھر بھی دل کا ہر ورق سادہ رہا

وزیری پانی پتی

غزل

کوئی اس راز سے کب باخبر ہے
کہ غم سرمایۂ فکر و نظر ہے
اگر نا معتبر بھی ہوں اجالے
اجالوں کی طلب تو معتبر ہے
مری نظروں میں تو ہے صرف تو ہی
مگر تیری زمانے پر نظر ہے
محبت کے مسافر کی نظر میں
یہ دنیا رہ گزر ہی رہ گزر ہے

عتیق تابش

غزل

تم تشنگیِ شوق مٹا کیوں نہیں دیتے
کچھ زہر ہے درکار پلا کیوں نہیں دیتے
جلاد ہے تلوار ہے زنداں ہے رسن ہے
حاضر ہیں خطا وار سزا کیوں نہیں دیتے
کچھ جرم نہیں خونِ دل و جان لے تابش
ہاتھ آئی ہے دولت تو لٹا کیوں نہیں دیتے

چندر پرتاب سنگھ نظر

غزل

ترکِ محبت ناممکن ہے
چاہے اب الزام ہی آئے!
ان کے لبوں پر بھولے سے میرا!
ذکر نہیں تو نام ہی آئے!
میخانے تک بھولا بھٹکا!
کاش غمِ ایام ہی آئے!
کیسے تھے بدبخت نظر ہم
دنیا سے گمنام ہی آئے

وصی سیتاپوری

غزل

معیار خود آگاہی جب تک نہ سنور جائے
انساں کی حقیقت پر کس طرح نظر جائے
تم منظرِ ہستی پر کچھ اور ٹھہر جاؤ
ممکن ہے مرا ذوقِ دیدار سنور جائے
میعادِ اسیری میں یہ شرط بھی شامل ہے
تعمیرِ نشیمن کا احساس نہ مر جائے
ہنگامہ نوازی کے دیوانے یہ کہتے ہیں
طوفاں وہ نہیں ہے جو خاموش گزر جائے

مراسلات

اُردو میں سائنس کے اوّلین کارنامے

اس عنوان کے ماتحت یکم اپریل ۱۹۶۱ء کے اخبار "ہماری زبان" میں خواجہ حمید الدین شاہد صاحب کے ایک مضمون کا اقتباس پیش کیا گیا ہے جس سے کئی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ذیل میں اس اقتباس کے کچھ ٹکڑے درج کر کے صحیح صورتِ حال پیش کی جائیگی۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں:-

ا۔ اُردو زبان میں سائنس کی سب سے قدیم کتاب "بحرِ حکمت" ہے جو ۱۲۱۳ھ مطابق ۱۷۹۸ء میں لکھنؤ کے مطبع مسیحائی میں طبع ہوئی تھی۔

ب۔ جناب سجاد مرزا صاحب .... جنھوں نے فنِ طباعت کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا ہے، مجھ سے اس امر کا انکشاف کیا تھا کہ بحرِ حکمت سب سے پہلی اُردو کتاب ہے جو لیتھو پریس میں چھپی ہے۔

ج۔ بحرِ حکمت پادری پرکنس صاحب کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔

د۔ پوری کتاب میں کسی صفحے پر کہیں بھی مترجم کا نام درج نہیں ہے۔

بحرِ حکمت میں دخانی جہاز کے انجن کے اجزا اور پُرزے اور ان کے کام کرنے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ مطالب کو واضح کرنے کے لئے بہت اچھی تصویریں اور نقشے کتاب میں شامل کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب لیتھو کی چھپائی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ لیکن نہ وہ اُردو زبان میں سائنس کی پہلی کتاب ہے، نہ وہ اُردو کی پہلی کتاب ہے جو لیتھو پریس میں چھپی، نہ اسکے مصنف پادری پرکنس صاحب ہیں، نہ اس کے مترجم کا نام نامعلوم ہے۔ کتاب کا صرف سرورق دیکھ کر یہ غلط رائیں قائم کر لی گئی ہیں۔ کتاب کے آخر میں لیتھو کی چھپی ہوئی جو انگریزی عبارت شامل ہے اس پر نظر نہیں کی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل انگریزی کتاب کے مصنف کا نام کہیں درج نہیں ہے۔ اُس کا اُردو میں ترجمہ پادری پرکنس نے کیا ہے۔ اُسی انگریزی عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ مارچ ۱۸۴۸ء میں کیا گیا۔ جو کتاب ۱۸۴۸ء میں وجود میں آئی وہ پچاس برس پہلے ۱۷۹۸ء میں کیونکر چھپ سکتی تھی۔ مارچ ۱۸۴۸ء کا مہینا ۱۲۶۴ھ میں ۲۴ ربیع الاول سے شروع ہو کر ۲۴ ربیع الثانی کو ختم ہوا۔ اس طرح بحرِ حکمت کے وجود میں آنے کا ہجری سنہ ۱۲۶۴ قرار پاتا ہے اور یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ سرورق پر سنہ ۱۲۱۳ھ جو درج ہے وہ کتابت کی غلطی ہے۔ فنِ طباعت کی تاریخ سے سطحی واقفیت رکھنے والا بھی جانتا ہے کہ مطبع مسیحائی کا کیا ذکر سنہ ۱۲۱۳ھ میں کسی مطبع کا بھی لکھنؤ میں وجود نہ تھا۔ اور لکھنؤ کا کیا ذکر ہندوستان کے طول و عرض میں کوئی لیتھو پریس اس سنہ میں کہیں موجود نہ تھا۔

(سید مسعود حسن رضوی ادیب)

ہجو، طنز، مزاح

انگریزی الفاظ سٹائر، آئرنی، ہیومر کے مذکورۂ بالا ترجموں پر "ہماری زبان" میں ایک بحث کا فیصلہ ادارے کی جانب سے جناب آلِ احمد سرور نے یہ دیا ہے کہ سٹائر کے لئے طنز، آئرنی کے لئے رمز اور ہیومر کے لئے مزاح اُردو میں موزوں ترجمہ ہے۔ ہیومر کے لئے مزاح کی صحت کے متعلق کچھ کہنے کی ابھی ضرورت نہیں۔ لیکن سٹائر کے لئے طنز اور آئرنی کے لئے رمز محلِ نظر ہے۔

اس سلسلے میں سب سے اہم اصولی نکتہ یہ ہے کہ ہمیں عام الفاظ نہیں، چند ادبی اصطلاحوں کا ترجمہ کرنا ہے۔ ایسے ترجمے کے لئے دو باتیں ضروری ہیں۔ اول یہ کہ ترجمہ ایسا بھرپور ہو کہ مفہوم کے تمام تضمنات پر حاوی ہو سکے۔ دوم، غیر زبان سے جو بھی ترجمہ ہو اُسے حتی الامکان اپنی لسانی روایات کے پس منظر میں دیکھا جائے۔ چنانچہ سٹائر، آئرنی اور ہیومر کی ادبی اصطلاحات اُردو ادب میں انگریزی سے مستعار لی گئی ہیں۔ اس لئے کہ انگریزی ادب کی واقفیت سے قبل ہمارے یہاں اس نوعیت کی مستقل اصناف یا اسلوب نہیں تھے۔ انگریزی ہی کے زیرِ اثر تنقیدی شعور نے مذکورہ ادبی طریقوں کے درمیان امتیاز و استقلال کی جستجو کی۔ لیکن ان طریقوں کے اجزا و عناصر ضمنی طور پر ضرور ہمارے ادب میں پائے جاتے تھے۔ لہٰذا مذکورہ انگریزی اصطلاحوں کے لئے اُردو میں ہم معنی الفاظ متعین کرنے کے لئے ان مسلّم حقائق کو ناگزیر طور پر پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔

انگریزی یا کسی غیر زبان کی اصطلاحات کے ترجمے کے لئے ہم جس کلاسکی زبان کی طرف رجوع کرتے ہیں وہ عربی ہے۔ لہٰذا اصطلاحی ترجمے میں عربی الفاظ کے مفہوم کی باریکیوں سے آشنا ہونا ضروری ہے۔ عربی میں طنز کا مفہوم ہوتا ہے، اشارے کنایے سے یا بالواسطہ طور پر کسی ایسی حقیقت کا ابلاغ جو خوشگوار نہ ہو۔ بعینہٖ یہی مفہوم انگریزی میں آئرنی کا ہے۔ عربی میں رمز کا معنی صرف بھید ہے۔ ظاہر ہے کہ آئرنی محض بھید تک محدود نہیں۔ اس کے لئے انگریزی میں سیکریٹ وغیرہ دوسرے الفاظ ہیں۔ طنز کے خلاف ہجو میں مذمت کرنے والا ابزار لطافتوں کے پردے میں بھی اپنی نیت کو مشتبہ نہیں رکھتا۔ ہجو کا مطلب گالی گلوچ نہیں، یہ بھی شائستہ مذمت ہے۔ طنز سے اس کا فرق یہ ہے کہ ہجو کا وار دوٹوک اور بھرپور ہوتا ہے۔ اور طنز کا تیر نیم کش ہے۔ طنز کے برخلاف ہجو میں باریکی نہیں ہوتی۔ لیکن

شائستگی کا عنصر دونوں میں مشترک ہے۔ چنانچہ ہجو کا پورا مترادف انگریزی میں سٹائر ہی ہے۔

اس سلسلے میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ لفظ ہجو کے اصطلاحی مفہوم کی عربی میں تو ایک مستقل روایت رہی ہے۔ اردو کے قدیم ادب میں بھی یہ روایت واضح طور پر پائی جاتی ہے۔ قدیم تذکروں میں کہیں بھی سودا وغیرہ کے زہر آگیں رشحات قلم کو طنز سے نہیں تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف 'آب حیات' تک سودا کی 'ہجویات' ہی کے چرچے رہے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سٹائر کا اردو مترادف متعین کرنے کے لئے لفظ ہجو کے اس قدیم روایتی پس منظر کا لحاظ کیا جائے یا لفظ طنز کے کچھ حلقوں میں نئے چلن کا؟ یہ بات اہم نہیں کہ مفہوم کی باریکیاں 'ہجو' کی موزونیت کا اعلان کرتی ہیں۔ چنانچہ اگر سٹائر کے لئے ہجو کو اختیار کیا جائے تو اس سے دونوں فائدے حاصل ہو جاتے ہیں۔ لسانی اعتبار سے صحیح ترجمہ ہوتا ہے اور ادبی لحاظ سے قدیم 'ہجویات' کے لئے ایک نامانوس طریق تعبیر کی زحمت سے ہم بچ جاتے ہیں۔ طنز کو محض اس لئے اختیار کرنا نادانی ہوگی کہ کچھ خاص نقادوں اور عام لکھنے والوں کے نوک قلم پر یہ لفظ کسی حد تک چل نکلا ہے۔ علمی سطح پر ابھی تو ہم عبوری دور ہی سے گزر رہے ہیں۔ کوئی روایت یا رواج قائم و مستحکم تو ہو نہیں گیا کہ خواہ مخواہ بازار میں چلتے ہوئے ایک لفظ کو اٹھا کر سند علم پر بٹھا دیا جائے!

قبل اس بحث میں حصہ لیتے ہوئے میں نے واضح کیا تھا کہ آئرنی کوئی مستقل صنف ادب نہیں، یہ سٹائر کے متعدد طریقوں میں ایک لطیف ترین طریقہ ہے۔ اس نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے تو آئرنی کے لئے 'طنز' ہی موزوں مترادف ہے۔ ورنہ محض 'رمز' تو سٹائر کے کسی کام کا نہیں۔ 'دل کی رمز' سننے والا سمجھ بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ دونوں صورتوں میں اس کے دل پر کوئی چوٹ نہیں پڑتی۔ سمجھ جانے کی صورت میں زیادہ سے زیادہ معرفت حاصل ہو سکتی ہے، بصیرت مل سکتی ہے۔ لیکن سٹائر میں ضرورت چوٹ کی ہے، کچوکے کی ہے، نیش اور نشتر کی ہے۔ اور یہ سب اثرات رمز کے حدود سے باہر ہیں۔ یہاں طنز ہی کارگر ہو سکتا ہے۔ یہاں ایک 'بت طناز' کی ضرورت ہے، جس کی عشوہ گری کچھ اس طرح ہو:— ع

عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

اصل میں آئرنی ایک طعنہ ہے جو خاص طور پر قول محال (پیراڈوکس) کے ذریعے اثر آفریں ہوتا ہے۔ اس میں کچھ ہجو کی دھیان و ہشیاری کا امتزاج ہوتا ہے۔ کہتے کچھ ہیں لیکن سمجھتے کچھ اور ہیں سہ

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

چنانچہ سٹائر کا قد و قامت 'ہجو' ہی کو حاصل ہو سکتا ہے۔ ہجو میں جو وزن، وسعت اور وقار ہے طنز کی سبکی اور نازکی اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ ہجو صرف طنز تک محدود نہیں۔ ظرافت، مزاح، پھبتی، ذہانت۔ یہاں تک کہ گالی وغیرہ کے [illegible]

اور ایک مکمل بسیط ہو ان تمام چھوٹے چھوٹے اجزا کو ایک خاص تناسب اور توازن سے ترکیب دے کر تصنیف ہوتی ہے۔

آخر میں ضمنی طور پر ہیومر کے متعلق عرض کروں گا۔ جیسا کہ آل احمد سرور صاحب نے فیصلہ دیا ہے اس کا موزوں اردو مترادف 'مزاح' ہی ہو سکتا ہے۔ 'ظرافت' قطعاً نہیں جیسا کہ کلیم الدین احمد صاحب سمجھتے ہیں۔ ظرافت کے لئے انگریزی میں دوسرا لفظ 'وٹ' موجود ہے۔ وٹ اور ظرافت دونوں میں ذہنی مسرت یا دماغی تفریح کا مفہوم مشترک ہے۔ یہ خوش طبعی بھی ہے اور دانائی بھی۔ خوش طبعی اور دانائی کے دونوں عناصر انگریزی لفظ وٹ اور عربی لفظ ظرافت کے بنیادی مفہوم میں شامل ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ ظرافت کو اس کے مناسب محل سے ہٹا کر ایک ایسے لفظ 'ہیومر' کا مترادف قرار دیا جائے جو ظرافت کے صرف نصف مفہوم خوش طبعی پر حاوی ہے اور جس کے لئے پہلے سے ہماری زبان میں مروّج و مسلم ایک موزوں لفظ 'مزاح' موجود ہے اور جو لفظ ہیومر کے تمام معنوی تضمنات کو بخوبی ادا کرتا ہے۔ ہیومر اور مزاح دونوں میں ہلکے پھلکے شائستہ مذاق کی حس پائی جاتی ہے۔ ان میں وٹ اور ظرافت کی طرح ذہنی ورزش کا کوئی شائبہ نہیں۔ یہ ایک سیدھی سادی پُرلطف کیفیت ہے جو بغیر کسی دماغی ریاضت کے فی البدیہہ محسوس کی جاتی ہے۔ (عبد المغنی)

چار نقطے یا طوئے کا استعمال

مہربانی کر کے کوئی صاحب اس پر روشنی ڈالیں کہ جب فارسی خط ہندوستان میں آیا تو اردو والوں نے مقامی بولیوں کے لحاظ سے مائل حرفوں پر پہلے چار نقطے بعد میں طوئے بڑھا کر ٹ، ڈ، ڑ حروف وضع کئے۔ چنانچہ قدیم مخطوطات کی کتابت میں ان حرفوں کے لئے چار نقطے ہی استعمال کئے گئے ہیں۔ بعد میں مطبوعات میں نقطوں کے بجائے طوئے کا استعمال ہونے لگا۔ یہ (ط) کا آغاز کس نے کیا اور کب عمل میں آیا؟ (نمبر خریدار ۲۵۷)

انجمن کا خبرنامہ

کان پور میں اُردو کے حقوق کا تحفظ

۲۹ را پریل کو مجلس انتظامیہ جمیعۃ علماء شہر کانپور کا ایک جلسہ قاضی مختار احمد کی صدارت میں ہوا جس میں ارکان مجلس انتظامیہ کے علاوہ حلقہ جات جمیعۃ علما کے ممبران نے بھی شرکت کی۔ جلسے نے اپنی دو گھنٹہ کی نشست میں ضروری مسائل اور اہم معاملات پر غور کیا۔

جلسے نے ایک رزولیوشن میں کہا کہ کانپور میں اُردو بولنے اور سمجھنے والے کثیر تعداد میں رہتے ہیں اُردو داں طبقہ بھی کارپوریشن کے مقاصد کو سمجھ کر اس سے پوری طرح تعاون کرنا چاہتا ہے اس لئے یہ جلسہ ذمہ داران کارپوریشن سے مطالبہ کرتا ہے کہ کارپوریشن آزادی سے قبل کی طرح اپنی تمام دفتری کارروائی پبلک کے نوٹس، اور اطلاعات وغیرہ اردو زبان اور اُردو رسم الخط میں بھی شائع کرے۔

رزولیوشن میں ممبران کارپوریشن سے کہا گیا ہے کہ وہ اُردو کو فروغ دینے اور اس کے جائز حق کی حصول کے لئے کارپوریشن کے جلسوں میں پوری طرح جد و جہد کریں۔ (قومی آواز لکھنؤ)

رانچی میں اُردو بولنے والے چالیس فی صدی

مردم شماری کی ہماہمی کو ختم ہوئے مہینوں ہو گئے ہیں۔ سارے ہندوستان میں عموماً اور رانچی کے اُردو داں حضرات کا خصوصاً جنھوں نے اس مردم شماری میں حصہ لیا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ رانچی میں تمام چھوٹے بڑے، بچے بوڑھے حتیٰ کہ عورتوں نے بھی کافی دل چسپی لی اور اپنی مادری زبان اُردو لکھوائی۔

کہیں کہیں پر شہر میں انومسر پرٹس اور افسر انچارج کی دھاندلی کا پتہ بھی چلتا رہا پھر بھی کام بڑے سکون سے ہوا۔

اب پتہ چلا ہے کہ رانچی میں جہاں ۱۹۵۱ء کی مردم شماری میں اُردو بولنے والوں کی تعداد "کل ۳ فی صدی" ظاہر کی گئی تھی وہاں ۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں رانچی میں اُردو بولنے والوں کی تعداد "چالیس فی صدی" ہو گئی ہے۔

اُردو سے دل چسپی رکھنے والے اور اُردو جاننے والے تھوڑی سی دلچسپی اور لیتے تو اور انومسر پرٹس و افسر انچارج بعض جگہوں پر لوگوں کو ڈراتے دھمکاتے نہیں تو اُردو بولنے والوں کی تعداد اور بڑھ جاتی اس لئے کہ اس شہر میں ملک کے تمام حصے کے لوگ بستے ہیں ان میں سکھ، پنجابی اور سندھی حضرات کافی تعداد میں شامل ہیں اس کے علاوہ ہزاروں اُردو دوستوں نے بھی اپنی مادری زبان اُردو لکھائی ہے۔

اب سننے میں آ رہا ہے کہ رانچی اور بہار کے بہت سے ضلعوں میں اُردو زبان نے جو ایک مقام حاصل کر لیا ہے وہ فرقہ پرستوں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا ہے اور ملک کی اس پیاری زبان کی قدر و منزلت کو وہ گھٹانے کی سعی میں لگے ہوئے ہیں اور یہ افواہ اڑا رہے ہیں کہ دوبارہ اس سلسلے میں دوبارہ تحقیقات ہوگی۔

اگر یہ خبر خدانخواستہ صحیح ثابت ہو اور فرقہ پرستوں کی خواہشات پوری بھی ہو جائیں تو اس سے اُردو کے ہمدردوں کو گھبرانا نہیں چاہیے بلکہ ایک مرتبہ پھر کمر باندھ کر میدان میں آ جانا چاہیے اور پوری مستعدی کے ساتھ کام کر کے لوگوں کو دکھا دینا چاہیے کہ اُردو زبان ملک کی پیاری اور قانونی زبان ہے۔

انجمن ترقی اُردو رانچی ان تمام لوگوں کی مشکور ہے جنھوں نے ۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں اپنا قیمتی وقت دے کر اس پیاری اور مادری زبان کو عزت بخشی اور ایک مقام دلوایا۔

آخر میں بہار ریاستی انجمن ترقی اُردو سے بس اتنا عرض کروں گا کہ وہ اس بے بنیاد خبر کی تصدیق کرے اور اگر افواہ صحیح ہو تو اس سلسلے میں ضروری اقدامات کرے۔ (قمر رانچوی صدر انجمن ترقی اُردو رانچی۔ بہار)

یوم اقبال

مورخہ ۲۱ را پریل ۱۹۶۱ء بزم اطفال دلشکر گوالیار کی جانب سے ملک کے عظیم شاعر ڈاکٹر اقبال کی یاد کو تازہ کرنے کے لئے "یوم اقبال" منایا گیا اس موقع پر بچوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ اس جلسے کی خصوصیت یہ تھی کہ سوائے صدر کے ننھے منے بچوں نے ہی اپنے ہر دل عزیز شاعر کے حالات زندگی اور شاعری پر مضامین و نظمیں پڑھیں اور تقاریر کیں۔

جلسے کا آغاز اقبال کی مشہور نظم "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" سے ہوا جسے پرکاش سکسینہ نے پڑھ کر سنایا۔ اس کے بعد ایک بچی مہرالنسا نے نظم "بچے کی تمنا" پڑھی۔

حمید اللہ نے "اقبال اور ہم" اور خلیل الرحمان نے "بچے اور اقبال" کے عنوانات سے مقالات پڑھے۔ مکالمہ "یوم اقبال" طارق اور مشرف نے بڑے اچھے انداز میں پیش کیا۔ قمرالدین، فریدالدین اور محمد یونس نے اقبال کے حالات زندگی اور شاعری پر تقریریں کیں۔ اطہر علی اور قیصر محمد نے "ہمدردی" اور "ترانہ ملی" نظمیں پڑھیں۔

جلسے کا اختتام جناب صدر وکیل امتیاز علی صاحب کی تقریر پر ہوا۔ موصوف نے اپنی تقریر میں بچوں سے اقبال کے پیغام محبت اور انسانیت کو اپنانے اور عمل کرنے کی اپیل کی۔

(سکریٹری محمد یونس لشکر۔ گوالیار)

تصحیح

"ہماری زبان" ۱۵ را پریل ۱۹۶۱ء میں حضرت امجد حیدر آبادی کی عمر (۸۳) سال لکھی گئی ہے جو صحیح نہیں ہے۔ صحیح تاریخیں حسب ذیل ہیں :-

ولادت : ۷ رجب ۱۳۰۵ھ مطابق ۲۱ رمارچ ۱۸۸۸ء

وفات : ۱۱ رشوال المکرم ۱۳۸۰ھ مطابق ۲۹ رمارچ ۱۹۶۱ء

(محمد عمر یوسفی۔ حیدر آباد)

اُردو مجلس حیدرآباد ۱۹۶۱ء کا پروگرام اُردو مجلس حیدرآباد کی سنہ ۱۹۶۱ء کی ادبی مصروفیات کے پروگرام میں ماہانہ ادبی اجلاسوں کے علاوہ اس کے سہ ماہی ترجمان "مجلس" کے "مومن نمبر" کی اشاعت ہے جو اس وقت زیرِ طبع ہے اور جس میں مومن کی حیات اور شاعری پر مشہور ادیبوں کے مضامین شائع کئے جا رہے ہیں۔ اس سال اُردو مجلس کی جانب سے عہدِ حاضر کی دو مشہور ادبی شخصیتوں کی پُر خلوص ادبی خدمات کا اعتراف کیا جائے گا جن میں سے ایک نے نظم اور دوسرے نے نثر کے میدان میں گراں قدر اور بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ ۱۳ و ۱۴ مئی ۱۹۶۱ء کو یومِ فراق گورکھپوری منایا جائے گا۔ اور ماہ دسمبر ۱۹۶۱ء کے آخری ہفتے میں علامہ نیاز فتح پوری کی ادبی خدمات کے اعتراف کے لئے اُردو ہال حمایت نگر میں ایک جلسہ منعقد ہوگا۔

رائے جانکی پرشاد صاحب صدر اُردو مجلس، حیدرآباد نے توقع ظاہر فرمائی ہے کہ ان جلسوں کے کامیاب بنانے میں اردو مجلس کو ہمیشہ کی طرح اُردو دوستوں کا پورا پورا تعاون حاصل ہوگا۔

(محمد منظور احمد۔ معتمد)

شاخ سیوان سنہ ۱۹۶۱ء میں شاخ کے تین اہم جلسوں کی رپورٹ حسبِ ذیل ہے:۔

۱۲ فروری سنہ ۱۹۶۱ء۔ صدارت: زوّار حسین، ایم۔ ایل۔ اے۔

منظور شدہ تجاویز حسبِ ذیل ہیں:۔

تجویز نمبر۱۔ باتفاق رائے یہ طے پایا کہ بہار ریاستی انجمن ترقی اُردو کی شاخ سیوان کو شہر میں از سرِ نو زندہ کیا جائے۔ اور الحاق کی کارروائی عمل میں لائی جائے۔

تجویز نمبر۲۔ باتفاق رائے یہ طے پایا کہ بہار ریاستی انجمن ترقی اُردو کے ذیلی قوانین مقامی شاخ سیوان کے لئے منظور کئے جائیں۔

تجویز نمبر۳۔ بموجب دفعہ ۵۔ ذیلی قوانین بہار ریاستی انجمن ترقی اُردو حسبِ ذیل عہدیداران کا انتخاب باتفاق آرا انجمن ترقی اُردو شاخ سیوان کے لئے ہوا:۔ صدر۔ بابو راد ھا پرشاد صاحب وکیل۔

نائبین صدر: سردار ہرنام سنگھ، بابو شام کشور پرشاد سریواستو وکیل، حکیم بشیر الدین قادری، جنرل سکریٹری: سید غلام حسین مختار۔ سکریٹریز:۔ بابو سریندر ناتھ ورما۔ شمشاد علی خاں، محمد شعیب۔ خازن: عبد الحمید۔

تجویز نمبر۴۔ باتفاق آرا حسبِ ذیل افراد و ممبران کے اسمائے گرامی مجلس عاملہ کے لئے منظور کئے گئے:۔

(۱) مولوی محمد عزیز صاحب رئیس سیوان، (۲) مولوی زوّار حسین وکیل ایم۔ ایل۔ اے، (۳) احمد غنی، (۴) مظفر حسین قاسمی، (۵) نور الہدیٰ یکتا، (۶) منصور عالم (۷) الحاج محمد یوسف خاں، (۸) محمد سعید برکی (۹) محمد رسول (۱۰) انیس الرحمٰن سیوان، (۱۱) حاجی زین العابدین (۱۲) محمد قاسم۔

تجویز نمبر۵۔ یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ علاوہ مجلس عاملہ کے تین سکریٹریز پروپیگنڈا اور نشر و اشاعت کے لئے منتخب کئے جائیں۔ چنانچہ صلاح الدین دربار، ڈاکٹر جلیل احمد آزاد۔ اور دیہی علاقہ کے لئے مطیع الرحمٰن کا انتخاب عمل میں آیا۔

جلسہ جناب صدر و حاضرینِ جلسہ کے شکریہ کے بعد ۱۲½ بجے دن میں برخاست ہوا۔ (صدر جلسہ زوّار حسین) ۱۲/۲/۶۱

۱۹ فروری ۱۹۶۱ء۔ صدارت: الحاج محمد یوسف خاں وکیل۔

منظور شدہ تجاویز حسبِ ذیل ہیں:۔

تجویز نمبر۱۔ طے پایا کہ "سنگم" ہفتہ وار پٹنہ، اور ہماری زبان علی گڑھ کا اجرا کر لیا جائے اور سکریٹری کو اختیار دیا جائے کہ دونوں اخباروں کا سالانہ چندہ روانہ کر دیں۔

تجویز نمبر۲۔ طے پایا کہ ماہ اپریل سنہ ۱۹۶۱ء کے اندر ضلع اُردو کانفرنس منعقد کی جائے اور تعین تاریخ کے لئے سب ڈویژن گوپال گنج اور صدر کے اصحاب سے مشورہ کرنے کے واسطے مولوی ایم۔ این۔ احمد غنی و مظفر حسین قاسمی و محمد قاسم وکیل و مولوی غلام حسین مختار کو تعینات کیا جاتا ہے اور نیز فنڈ کی فراہمی کے لئے رسیدات چھپوائی جائیں۔

تجویز نمبر۳۔ طے پایا کہ مردم شماری کے دوران کالم ۱۴ مادری زبان اُردو کے ساتھ بدعنوانیوں کی اطلاع اب تک انجمن کو پہنچ چکی ہے ان پر ایک رپورٹ سکریٹری انجمن ترقی اُردو مرتب کر کے سب ڈویژنل مردم شماری افسر کو روانہ کر دیں۔ تاکہ اس کی مناسب جانچ کرائی جا سکے۔

(صدر، محمد یوسف خاں)

نوٹ:۔ تجویز نمبر۳ کے مطابق جنرل سکریٹری نے ایک رپورٹ ۲۲ فروری ۶۱ء کو سب ڈویژنل آفیسر کی خدمت میں پیش کی اور کل حالات سے باخبر کیا۔ توجہ سے انھوں نے سُنا اور جس پر ۲۴ فروری ۶۱ء کو سب ڈویژنل آفس سے ہدایات ضروری جاری ہوئیں۔ اور شکایات کو دور کرنے کی افسر موصوف نے کوشش کی۔ اگر ضرورت سمجھیں تو اس کا ذکر کر دیں گے۔

انجمن ترقی اُردو سیوان کا ایک جلسہ زیر صدارت مولوی محمد عزیز صاحب رئیس سیوان بتاریخ ۲۶ مارچ سنہ ۱۹۶۱ء بروز اتوار ۹ بجے دن صدر موصوف کے مکان پر منعقد ہوا اور حسبِ ذیل تجاویز باتفاق آرا منظور ہوئیں:۔

تجویز نمبر۱۔ گذشتہ کارروائی کی تصدیق کی گئی۔

تجویز نمبر۲۔ طے پایا کہ ایم۔ این۔ احمد صاحب، صلاح الدین صاحب گوپال گنج کے ہمدردانِ اُردو سے مشورہ کر کے تاریخ کا تعین اور فنڈ کی فراہمی کے لئے اپنی رپورٹ پیش کریں گے، اور غلام حسین صاحب و محمد قاسم صاحب وکیل اور مطیع الرحمٰن صاحب چھپرہ جا کر وہاں کے ہمدردانِ اُردو سے تعین تاریخ اور فنڈ کی فراہمی کے لئے مشورہ کریں گے، اُس وقت تک کانفرنس کی تاریخ کا تعین ملتوی رہے گا۔ نیز یہ بھی طے پایا کہ وفد کی واپسی اور رپورٹ ملنے تک باقی ماندہ امور پر غور و خوض کرنا ملتوی کر دیا جائے۔ (صدر جلسہ۔ محمد عزیز)

اقبال کرشن

اُردو اور ٹیگور

(یہ سلسلہ بہت پہلے شروع ہونا چاہیے تھا لیکن اب کیا کیجئے کہ ہیچ اس ٹیگور صدی کی جا بجی میں یہ تجویز ذہن گزیں ہوئی کہ) ٹیگور سے متعلق اردو کتابوں پر تعارفی نوٹ لکھے جائیں، اور ہمیں پتہ چلے کہ اُردو نے اپنی شاندار روایات کے مطابق اس عظیم شاعر کا استقبال کیا یا نہیں۔ دوسرے حضرات بھی ایسی کتابوں پر تعارفی نوٹ لکھیں اور ارسال کریں۔

(ا۔ ک۔)

کلام ٹیگور ۔ ۲۰۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ٹیگور کے ۱۰۲ گیتوں اور نظموں کا اُردو ترجمہ پیش کرتی ہے۔ ترجمہ شانتی نکیتان کے پروفیسر ایم ضیاء الدین کا کیا ہوا ہے۔ کتاب ٹائپ میں ہستی پریس الہ آباد سے چھپی اور وشو ابھارتی بک شاپ، کلکتہ سے شائع ہوئی۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ ہے۔ سنہ تالیف ۱۹۳۵ ہے۔ اس کتاب کو بطور شکریہ ہز ایگزالٹڈ ہائی نس حضور نظام فرمانروائے دکن (خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ) کو پیش کیا گیا ہے۔ تمہید کے زیر عنوان ایک پُر مغز مقالہ ایم ضیاء الدین صاحب کا ہے۔ یہ مقالہ ۱۴ صفحات تک چلا گیا ہے۔ ٹیگور کی شاعری پر اچھا خاصا تبصرہ کیا گیا ہے۔ ایک اقتباس:

> اُردو ادیبوں پر جس چیز کا سب سے زیادہ اثر ہوا ہے وہ ٹیگور کی انگریزی گیتانجلی ہے۔ اس اثر کے نتائج زیادہ تر وہ نثری نظمیں ہیں جو رسائل اور اخبارات میں 'ادبِ لطیف' اور 'ادبِ جمیل' وغیرہ عنوانوں کے ماتحت شائع ہوتی ہیں۔ ہمارے شعراء میں شاید حضرت جوش ملیح آبادی سب سے زیادہ ٹیگور کے رنگ سے متاثر نظر آتے ہیں۔

راز در راز ۔ ۹۴ صفحات پر مشتمل یہ چھوٹی سی کتاب ٹیگور کی پانچ کہانیوں کا اُردو ترجمہ پیش کرتی ہے۔ بھارت لینگ بھنڈار، امرت سر سے مارچ سنہ ۱۹۴۳ء کی شائع کردہ ہے۔ چونکہ شروع کے ۱۴ صفحات غائب ہیں اس لئے مترجم کا نام نہیں معلوم ہو سکا۔ کتاب مجلد اور ڈسٹ کور سے آراستہ ہے۔ قیمت بارہ آنہ ہے۔

شجر کے سائے تلے ۔ ۱۱۲ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ٹیگور کے کسی نفسیاتی افسانے کا اُردو ترجمہ ہے۔ ترجمہ شانتی نرائن شاد کا ہے۔ پبلیشر اینڈ سنز، امرتسر کا شائع کردہ ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ درج ہے۔ آخری ورق پر ٹیگور سے متعلق مزید کتابوں کی اشتہاری فہرست ہے۔

ٹیگور کے افسانے	دو روپیہ	آگ	تین روپیہ
گیتانجلی	عہ	دولت کا نشہ	عا
ٹیگور کی کہانیاں	عہ	چھچھاہٹ	۱۲ر
ٹیگور کے شاہکار	عہ	حکایاتِ ٹیگور	۱۲ر
بھونچال	عا	روپ لیکھا	۱۲ر
مشعلِ راہ	۱۲ر	ماسٹر جی	۱۲ر
ماں	عہ	کمٹ	۱۲ر
گورا	للعہ	دستاویز	۱۲ر
طوفان	ے	تخیلِ ٹیگور	—
ٹیگور کے قہقہے	—	پروازِ ٹیگور	—
سرد شعلے	عا	افسانۂ ٹیگور	—
جیون پربھات	سے	نغمۂ ٹیگور	—
بغاوت	عا	ٹیگور کے ناٹک	—
دنیا ایک کہانی ہے	۱۲ر		

میر انیس کے مقبرے کی تعمیر

لکھنؤ۔ ۴ رمئی جناب سید علی ظہیر کی کوٹھی پر ان کی صدارت میں لکھنؤ کے چند ممتاز ادیبوں کا ایک جلسہ ہوا جس میں اُردو کے مشہور شاعر میر انیس مرحوم کے مقبرہ کی تعمیر اور ان کے مکان کی مرمت، بقا اور تحفظ کی ایک کمیٹی بنائی گئی جس کا نام "یادگار انیس کمیٹی" رکھا گیا۔ اس کمیٹی میں مندرجہ ذیل عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا۔ صدر: سید علی ظہیر۔ نائب صدر: پنڈت آنند نرائن ملا۔ سید صدیق حسن۔ جنرل سکریٹری: سید عباس حسین۔ خازن: سید مسعود حسن رضوی۔ مہتمم نشر و اشاعت: مرزا رضا حسین۔

مرحومہ بیگم قدسیہ زیدی کی یادگار

علی گڑھ ۱۰ رمئی سنہ ۱۹۶۱ء۔ معلوم ہوا ہے کہ بیگم قدسیہ زیدی کے عقیدت مندوں اور احباب نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان کی مناسب یادگار قائم کرنے کے لئے علی گڑھ کے شہریوں اور دوسرے مقامات کے ادب دوستوں سے چندے کی اپیل کی جائے۔ اس غرض کے لئے ایک کمیٹی بنا دی گئی ہے جو جلد سے جلد مناسب یادگار کا فیصلہ کرے گی اور چندے کے لئے پبلک سے تعاون کی اپیل کرے گی۔

تصحیح

اشاعت یکم مئی سنہ ۱۹۶۱ء کے صفحہ (۶) پر "صدان الحکمہ" کی بجائے "صوان الحکمہ"۔ صفحہ (۷) پر "فریدۃ القصر" کی بجائے "خریدۃ القصر" اور صفحہ (۶) کالم ۱۔ سطر (۱۹) میں "چہار مقالے کے چوتھے مقالے میں" کی جگہ "چہار مقالے کے تیسرے مقالے میں" پڑھا جائے۔

اُردو کے اہم رسالے ۔۳۰　　گذشتہ سے پیوستہ

راشد الخیری کا رسالہ تمدن دہلی

عابد رضا بیدار

مولوی ذکاء اللہ مرحوم: (از نذیر احمد) "کلمۂ طیبہ کے عہد میں نے تو مسلمانوں کو کسی بات پر عموم کے ساتھ متفق ہوتے دیکھا نہیں جیسا کہ وہ آج کل اپنی یونی ورسٹی کے بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اسی تقریب میں بعض مسلمان یہ بھی پوچھ بیٹھتے ہیں کہ کلکتہ، مدراس، بمبئی، الٰہ آباد، پنجاب ایک چھوڑ پانچ پانچ سرکاری یونیورسٹیاں ہوتے ہوئے تعلیم کی گاڑی میں مسلم یونیورسٹی کے پانچویں پہیے کی کیا ضرورت ہے، اور چھٹی مسلم یونی ورسٹی کس قسم کے عالم پیدا کرے گی جو پانچ یونیورسٹیاں آج تک پیدا نہ کر سکیں۔ طرفداران مسلم یونیورسٹی اس سوال کے جواب بھی دیتے ہیں، مگر چونکہ خالی خولی جواب ہوتے ہیں سائل کی تشفی نہیں ہوتی۔ آج کو مولوی ذکاء اللہ زندہ ہوتے تو میں انھیں پیش کر دیتا کہ مسلم یونیورسٹی درجہ تکمیل کو پہنچ کر، وما ذالک علی اللہ بعزیز، ان جیسے عالم پیدا کرے گی۔ کریم النفس، وسیع الاخلاق، منکسر المزاج، روشن دماغ، متنوع المعلومات، کثیر التصانیف، خیر خواہ عامۂ خلائق، فیاض طبع، برٹش گورنمنٹ کے قدرشناس، ارادتمند، راسخ الاعتقاد، مصلح کل، مرنج و مرنجاں!

مولوی ذکاء اللہ کے ساتھ میرا ربط و ضبط بچپن سے شروع ہوا جبکہ وہ دہلی کالج یا دوش بخیر کی فارسی جماعت میں تھے اور میں عربی میں، مابین ہم، ہم ریاضیات میں ہم سبق تھے، ماسٹر رام چندر مرحوم کے شاگرد۔ مولوی ذکاء اللہ کی طبیعت کو ریاضیات کے ساتھ خداداد مناسبت تھی۔ اور وہ جماعت میں سب سے پیش پیش رہتے تھے، اور اسی وجہ سے وہ ماسٹر صاحب کے منظور نظر بھی تھے۔ چونکہ ماسٹر صاحب نے بڑے بڑے مباحثوں کے بعد عیسوی مذہب اختیار کر لیا تھا، ماسٹر صاحب کی مدت تک ہم نشینی کے شبہے سے لوگ مولوی ذکاء اللہ کو مذہب کی طرف سے مشتبہ بھی کرتے تھے۔ لیکن میں مولوی ذکاء اللہ کا سب سے پرانا ملاقاتی ہوں۔ ان کے معاصر جہاں تک مجھے معلوم ہے اکثر مر چکے ہیں۔ ایک میں گراں جان کسی مصلحت سے ارذل العمر کی سختیاں جھیلنے کو بچا ہوں، لیکن تا کجے۔ میں اب بھی گواہی دیتا ہوں، اور جہاں تک آدمی کو آدمی کے بطون کا علم ہو سکتا ہے، میرے علم میں مولوی ذکاء اللہ پکے موحد تھے۔ ایک صرف ایک، خدا کے بجمیع صفات الکمالیہ قائل؛ اور ایسا بالغ النظر جیسے مولوی ذکاء اللہ تھے سائنس کے معموں کو حل کرنے والے، ہرگز منکر خدائے واحد نہیں ہو سکتا

خیر یہ معاملہ تو بینہ و بین اللہ ہے۔ میں مولوی ذکاء اللہ کی جس ادا کو ہمیشہ استحسان سے دیکھتا رہا وہ یہ تھی کہ حسد ان کو چھو تک نہیں گیا تھا۔ وہ نہ کالجوں اور اسکولوں میں امتحان اور کھیلوں کے ذریعہ تنافس پیدا کیا جاتا ہے اور وہ بالآخر فی اغلب الاحوال حسد کی صورت پکڑ لیتا ہے۔ دنیاوی عروج کے اعتبار سے مولوی ذکاء اللہ نہ تو حکومت کے کسی منصب جلیل پر پہنچے اور نہ انھوں نے کچھ ایسی دولت ہی جمع کی۔ اس حرماں کا سبب یہ نہ تھا کہ ان کو اس کی قابلیت ہی نہ تھی بلکہ اصلی اور واقعی سبب یہ تھا کہ انھوں نے علمی دھنوں کے آگے دنیاوی عروج کی کچھ پروا نہ کی اور کی بھی تو اسی قدر کہ کسی کو دنیاوی عروج پر پہنچے ہوئے سُنا اور خوش ہو گئے۔ وہ علم ہی کو بڑی دولت اور بڑی حشمت سمجھتے تھے۔ انھوں نے ساری عمر، جو عمر طبعی سے تجاوز ہوئی، طالب علمی میں صرف کی اور پھر بھی نفس واپسیں تک ان کو علم سے سیری نہیں ہوئی اور وہ ھل من مزید ہی پکارتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے۔ وہ علم کو علم ہی کے لئے حاصل کرتے تھے، یعنی علم ہی ان کا مقصود بالذات تھا، ان خادموں کی طرح سے جو علم پر متفرع ہوتے ہیں اور جن کے لئے سب پڑھنے والے پڑھتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ!

جہاں تک فارسی کا تعلق تھا مولوی ذکاء اللہ کی کالج کی تعلیم صرف برائے نام تعلیم تھی، بدتر از جہل جس نے ہندستان کو تباہ کیا تھا۔ مولوی ذکاء اللہ مدرسے میں تو فارسی پڑھتے تھے، جہاں اور جس غرض سے ان دنوں کے رواج نے ان کو داخل کرایا تھا۔ مگر ماسٹر رام چندر کی صحبت ان کے دل و دماغ میں ایک مفید تعلیم کا بیج بو رہی تھی جس نے آخر کار مولوی ذکاء اللہ کو مولوی ذکاء اللہ بنایا۔ انھوں نے مدرسے سے نکل کر نوکری کی حالت میں، اور نوکری بھی سررشتہ تعلیم کی نوکری، از خود انگریزی کا شوق کیا اور اپنے مطالعے کے زور سے بے مدد استاد اس کو اس درجہ تک پہنچایا کہ گو وہ انگریزی بولنے میں بے مشقی کی وجہ سے جھجکتے تھے، مگر ان کی ہر طرح کی معلومات جو انھوں نے انگریزی کی بدولت جمع کی تھیں، اتنی وسیع تھیں کہ بی۔ اے اور ایم۔ اے کو نصیب نہیں ہوتی۔ مولوی ذکاء اللہ حکیموں کی طرح بے فیض نہ تھے کہ ان کو اتفاق سے کوئی نئی حکمی دوا معلوم بھی ہو گئی تو وہ دوسروں کو بتانے سے دریغ کرتے ہیں۔ مولوی ذکاء اللہ نے جو کچھ پڑھا یا تصنیفات، تالیفات، ملفوظات اور تراجم کے ذریعے سے اپنے سب ہموطنوں کو سکھایا۔ مولوی ذکاء اللہ نے بعض ایسی مبسوط کتابیں لکھی ہیں کہ ان کے حجم کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ شخص ایسی بڑی کتاب کے لکھنے کے لئے کیسے فرصت پاتا تھا۔ مولوی ذکاء اللہ کی ایک ادا، جس میں وہ منفرد تھے، ان کی مستقل مزاجی تھی کہ انھوں نے انگریزی کے اتنے تبحر پر بال برابر اپنی وضع کو نہیں بدلا، اور وہ باوجودیکہ سید احمد خاں کے پیرو تھے مگر انھوں نے ساری عمر ترکی ٹوپی نہیں اوڑھی، انگریزی جوتی نہیں پہنی۔ میں جاڑے کے دنوں میں ان کو بوڑھے بنئے کی طرح کا روئی دار پاجامہ پہنے دیکھتا اور ہنسا کرتا۔

غرض مولوی ذکاء اللہ کی وضع ظاہر بالطرز ماندو بود یا گفتگو سے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انگریزی ان کو چھو بھی گئی ہے۔ ہم مسلمان ہیں تو مذہباً وہ بھی مسلمان تھے، مگر ان کا دامن عصبیت اور تعصب سے بالکل پاک تھا اور [illegible] مذہب کو [illegible] تھے جیسے خلوص کے ساتھ ملتے اور حضرت غالب سب کے ساتھ ایک طرح کا سلوک کرتے

یہ ان کے اس خلوص ہی کا نتیجہ تھا کہ مرتوں بے تھے مولوی ذکاء اللہ اور برکات کی کسی بے قراری پادری صاحب (پادری اینڈروز) کو تھی۔ بظاہر دونوں میں سے کسی ایک کی غرض دنیاوی دوسرے سے متعلق نہ تھی مگر دونوں نے مذہب کی اصلیت کو سمجھا تھا اور ان کی باہمی محبت الحب للہ کی قسم سے تھی۔ مودۃ اہل صفا، چہ در رو و چہ در قفا!

میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ اگر آدھے درجن پادری اینڈروز جیسے انگریز، اور آدھے درجن مولوی ذکاء اللہ جیسے مسلمان ہوں، تو وہ وقت جلد آجائیگا کہ مسلمان اور انگریز دونوں اپنی اپنی جگہ سینے لگیں گے:

من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

تمدن کی چوتھی، پانچویں اور ساتویں جلد کے پرچوں میں مندرجہ ذیل جو اہم مشمولات ہیں (باقی جلدیں مجھے ملی نہیں):۔

نذیر احمد کی امہات الامۃ (قسط وار) جسے ضبطی کے بعد تمدن نے کتابی شکل میں دوبارہ چھاپا (۴ ؛ ۳) تا (۷ ؛ ۴)۔ حالی کی نظم "فراق دوست" (۴ ؛ ۲)، فانی کی نظم "دار فنا" (جو غالباً فانی کے کسی مجموعہ میں نہیں آسکی ہے) (۵ ؛ ۵) اقبال کے استاد ارشد گورگانی کی تصویر (۵ ؛ ۵) (ایڈیٹر کے تحسینی نوٹ کے ساتھ کہ ان کا چلن ہونا چاہیئے) سید لطف علی کی نظم "ستری" (۵ ؛ ۵)، سید ہاشمی فرید آبادی کا جلاء کے ایک حصے کا ترجمہ (۵ ؛ ۳) اور اقبال کی نظم فاطمہ بنت عبداللہ (۵ ؛ ۳) اور ساتویں جلد کے چھٹے شمارے ستمبر نمبر میں امہات الامۃ کے علاوہ سلطان حیدر جوش، قاضی احمد میاں اختر اور بیان یزدانی کی تحریریں (۷ ؛ ۶)

اکتوبر ۱۹۱۰ء جلد ۱۰ شمارہ ۱ سے اہتمام و ادارت قاری سرفراز حسین عزمی دہلوی اور ان کے صاحبزادے ایم۔ اے قاری کی طرف منتقل ہو گئی اور اسی نئی ملکیت و ادارت میں تمدن کم سے کم اپریل ۱۹۲۰ء تک ضرور جاری تھا۔ اس عہد میں نیاز فتحپوری کا کیوپڈ اور سائیک (۱۰ ؛ ۲) اور شہاب کی سرگزشت (۱۵ ؛ ۳) آصف علی دہلوی بار ایٹ لا کا خاکستر (۱۱ ؛ ۵) اور سید علی ظہیر بی۔ اے کا مضمون "بحر خیال کی لہریں" (۱۲ ؛ ۲) ابوالاعلیٰ مودودی کا تمہ وحیات انسانی (ستمبر ۱۹۱۸ء صفحہ ۹ تا صفحہ ۱۵) ابوالکلام آزاد کا "مساجد اور غیر مسلم" (۱۰ ؛ ۳-۴) آصف علی بیرسٹر دہلی کی غزل، ردیف "خط" (۱۰ ؛ ۶) اور نذر سجاد حیدر اور بیگم قاری کے اخبار نسائی کا اشتہار (۱۰ ؛ ۶) قابل ذکر ہیں۔ ابوالاعلیٰ مودودی کے اور مجمل مضمون کا آخر پیراگراف نقل کرنے کے قابل ہے۔ ان کی زندگی ہی میں اس کی تاریخی اہمیت ہو چکی ہے۔

مودودی "آخر میں ہم اصلاح اعمال کی طرف اپنے ابنائے قوم کو توجہ دلاتے ہیں اور ان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے اعمال کو درست کریں۔ اپنی عمروں کو بڑھانے کی کوشش کریں تاکہ ہر شخص کو اس جہان میں ایک وسیع میدان عمل ہاتھ آئے اور ہر شخص ایک زمانہ دراز تک زندہ رہ کر اپنی قوم اور اپنے ملک کی بہبودی کے لئے سعی بلیغ کر سکے۔"

اپریل ۱۹۱۸ء (۱۰ ؛ ۴) کے اداریے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ تمدن نومبر ۱۹۱۵ء سے مئی ۱۹۱۶ء تک بند رہا اور جون ۱۹۱۶ء میں دوبارہ جاری ہوا۔

بقیہ: اُردو ٹائپ

اُردو ٹائپ کی کمپوزنگ اگر کتابت کے مقابلہ میں کم خرچ نہ ہو سکے گی تو بھی اتنا ضرور ہوگا کہ اس کے مصارف کتابت کی اُجرت کے لگ بھگ ہو جائیں گے غرض جس طرح وہ تمام رکاوٹیں دور ہو جائیں گی جو اس وقت اُردو ٹائپ کے رواج اور مقبولیت میں حائل ہیں۔

جیسا کہ مراسلہ نگار موصوف نے لکھا ہے صرف اسپیلیں کرنے یا سرکاری و غیر سرکاری امداد سے کتب و رسائل کو ٹائپ میں چھاپ دینے سے کام نہیں چلتا۔ ان اسباب کو دور کرنا ضروری ہے جن کے باعث لوگ ٹائپ سے بدکتے ہیں۔ ان سطور میں انہی اسباب کا تجزیہ کیا گیا ہے اور اس مسئلے کا ایک امکانی حل بھی پیش کیا گیا ہے۔ اُردو کی ترقی کے لئے اس وقت جن مسائل کو حل کرنا اور جن مشکلات کو دور کرنا ضروری ہے ان میں یہ مسئلہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اگر ہماری زبان، انجمن یا کوئی اور ادارہ یا فرد وقت کی اس پکار کو سنے اور باہمی تعاون سے اس مسئلہ کو ہمیشہ کے لئے حل کر ڈالے تو یہ بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔ اس سے اُردو کی مقبولیت بھی بڑھے گی اس کی پوزیشن بھی مضبوط ہوگی۔ اور عروس اُردو کی روشن پیشانی کا کلنک بھی ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے گا۔

پبلشر نذیر حسن پرنٹر شمیم الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا